مباحث

[ڈاکٹر مراد ہوف مین کے خطاب کے بعد حاضرین کی طرف سے اٹھائے جانے والے سوالات اوران کی جوابات]

تہذیبوں کا تصادم اور اسلام اکیسویں صدی میں:

س. آپ کے خطاب سے میں سمجھا ہوں کہ تصادم کا اگر کوئی خطرہ موجود ہے تو وہ تہذیب و ثقافت کے درمیان ہے نہ کہ مذاہب کے مابین . چنانچہ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ پھر آخر مغرب کا رویہ اسلام کے بارے میں اتنا جارحانہ کیوں ہے؟

ج۔غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کے ضمن میں مسلمانوں کا نقطہ نظر بڑا حقیقت پسندانہ ہے۔سورۃ المائدہ کی آیات اس سلسلے میں بڑا واضح منشور پیش کرتی ہیں۔مسلمانوں نے حتی الوسع برداشت کا مظاہرہ کیا ہے۔مغرب کے بارے میں البتہ یہ کہنا ممکن نہیں کہ وہ مسلمانوں کے بارے میں حقیقت پسندانہ رویے کا اظہار کیوں نہیں کرتے۔

س. اسلامی طرزِ حکومت میں خلافت کے دوبارہ احیاء کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج۔ یہ سچ ہے کہ مسلمان سیاسی طور پر عدم استحکام کا شکار ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں اکثر لوگ خلافت کی واپسی کی خواہش رکھتے ہیں۔مسلمان ممالک کے حوالے سے بہرحال کوئی ایک بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی۔پھر خود اس زمانے کے کچھ حقائق ہیں،قومی ریاست [کا تصور]،جو مکمل طور پر غیر اسلامی ہے،کو نوآبادیاتی دور میں مسلم دنیا پر تھوپ دیا گیا ہے۔پھر ایک بڑا المیہ یہ

بھی ہوا جب منگولوں نے بغداد میں آخری [عباسی] خلیفہ کو قتل کر دیا۔ مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب یہ ہے کہ انہوں نے شریعت کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اب مسلمانوں کے زندہ رہنے کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ شریعت کا دامن تھامیں اور اپنے معاملات زندگی کو اس کے مطابق ڈھال لیں۔ اس طرح وہ ''خلیفہ'' کے بغیر بھی باوقار طور پر زندہ رہ سکتے ہیں۔

س. آپ نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ "ہنٹنگٹن ممکن ہے غلط ہو لیکن وہ احمق اور جاہل ہر گز نہیں تھا". کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہنٹنگٹن نے یہ نظریہ اس مقصد کے تحت پیش کیا تھا کہ مغرب خاص طور پر اسلام کو ہدف بنانے کی حکمت عملی تیار کرے.

ج۔ میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ یہودیوں نے ہنٹنگٹن کے نظریے کی مخالفت کی تھی۔ اور ہنٹنگٹن نے خود بھی مدافعانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ ذاتی طور پر ان کی یہ خواہش نہیں تھی کہ یہ تصادم لازماً وقوع پذیر ہو اس لیے ان کا رویہ جارحانہ نہیں بلکہ مدافعانہ تھا۔ چنانچہ میرا خیال نہیں کہ اس قسم کی سازش پس پردہ موجود ہو۔ (ہم بھی سازش کا لفظ کثرت سے استعمال کرنا پسند کرنے لگے ہیں۔) قومی پالیسیاں ماہرین ارضیات نہیں بناتے بلکہ ملکی حالات وحقائق اور مفادات کی روشنی میں بنائی جاتی ہیں۔ واشنگٹن بھی کسی ہنٹنگٹن جیسے مفکر کے تصوراتی دائرے میں مقید نہیں ہے، بلکہ اپنے مفادات کے حصول میں کوشاں ہے۔

س. بین الاقوامی سطح پر مختلف مذاهب کے مل جل کر رهنے اور کام کرنے کے لیے کوششیں کی جاتی هیں. لیکن هم یه دیکھتے هیں که حقوق انسانی کے پردے میں هر طرح کے اقداری نظام (value system) کی مخالفت کی جاتی هے یعنی ایك طرف بین المذاهب هم آهنگی اور تعاون پیدا کرنے کی کوششیں کی جاتی هیں اور دوسری طرف انسانی آزادی اور انسانی حقوق کے نام پر هر طرح

کے اقداری نظام کو رد کر دیا جاتا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ اسلام اس اقداری نظام (انسانی، اخلاقی، سماجی اقدار) کو بچانے کے لیے کیا کوششیں کر سکتا ہے؟

ج۔ میں کسی اسپرانتو [ملغوبہ] مذہب پر یقین نہیں رکھتا۔ مذاہب کا کردار یہ ہے کہ وہ انسان کے بنیادی منفی جذبات ورجحانات سے اس کی حفاظت کریں۔ آپ ایسا اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک ایسا کرنے کے لیے آپ کے پاس کوئی جذباتی سہارا موجود نہ ہو۔ مذاہب میں انسانوں کو جذباتی طور پر مصروف رکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ عقل و دانش کے نام پر کسی اور نظریے یا نظام میں یہ صلاحیت موجود نہیں ہے۔ ثانیاً کسی شناخت کے بغیر موجودہ حالات اور نظریات سے مصالحت میں خطرہ ہے۔ اگر آج آپ صرف اسقاط حمل اور ہم جنس پرستی کے حوالے سے اخلاقی حالت ملاحظہ کریں تو آپ دیکھیں گے (جرمنی کو ہی دیکھیں) کہ صرف مسلمان ایسے ہیں جو اس برائی کے خلاف کھڑے ہیں، کیتھولک چرچ تک نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ ہم جنس پرستوں کی شادیوں کے خلاف بھی مسلمانوں کا رویہ بڑا مضبوط اور آبرومندانہ ہے۔ اسلام درحقیقت ۲۴ قیراط سونے کی طرح کامل مذہب ہے۔ چنانچہ ہمیں [اقداری نظام کے خلاف کوششوں پر] خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

س۔ آج ہمیں مسلمان کہیں بھی کسی بین الاقوامی فورم کا حصہ نظر نہیں آتے۔ حال ہی میں ایک مفکر نے کہا ہے کہ "مسلمانوں میں دانشورانہ بالیدگی نظر نہیں آتی"۔ کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں؟

ج۔ یقیناً مسلمانوں میں دانشورانہ بصیرت اور بالیدگی کی کمی نہیں ہے۔ جس چیز کی کمی ہے وہ مہارت (skill) ہے۔ اس کا مطلب صلاحیت میں کمی نہیں۔ میڈیا ایک ہنرمندی ہے جس کے مخصوص اصول ہیں۔ اگر آپ ان اصولوں کی پابندی کریں تو آپ لوگوں کو کسی بھی کام پر مجبور کر

سکتے ہیں۔ آپ کسی بھی طرح کے خیالات یا نظریات کو صرف ۵۰ سیکنڈ میں دنیا بھر میں ٹیلی ویژن وغیرہ کے ذریعے پھیلا سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ ایسا کرنے کی پیشہ ورانہ کوشش کی جائے۔ اور یہ وہ میدان ہے جہاں مسلمانوں کے پاس مہارت کی کمی ہے۔ پاکستان اس وقت بہتر پوزیشن میں ہوتا اگر وہ تعلقات عامہ کی پیشہ ورانہ بنیادوں کے مطابق امریکیوں سے تعلقات استوار کرتا جیسا کہ دیگر مسلمان ممالک نے کیا ہے۔ یہ ایک مکمل طور پر فنی کام ہے۔ ہم کسی سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ: ''آخر آپ ہمیں سمجھتے کیوں نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہم سے محبت نہیں کرتے''؟

س. اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے اگر پوپ جان پال صلیبی جنگوں پر مسلمانوں سے معذرت کریں؟

ج۔ میری خواہش ہے کہ وہ کچھ اور کریں۔ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر تسلیم کریں۔ کیتھولک چرچ نے ۱۹۷۶ء میں اسلام کو نجات کا ایک راستہ تسلیم کیا تھا۔ لیکن انہوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس راستے پر قائد اور قرآن کو راہنما کتاب تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ کیونکہ وہ قرآن کو کلمۃ اللہ تسلیم کرنے سے خوف زدہ ہیں۔ چنانچہ پوپ کبھی بھی محمد کو قائد تسلیم نہیں کریں گے کیونکہ اس طرح خود ان کی بنیاد خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

اسلام: مغرب کے اندیشے اور مسلم ردعمل:

س. دنیا کے مختلف حصوں میں، اسلام کے تمام فرقوں میں آپس کے اختلافات عموماً ایک دوسرے سے سخت دشمنی کی حد تک پہنچ جاتے ہیں. آخر کیوں تمام فرقوں کے لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر آپس کے مسائل حل نہیں کر سکتے اور کسی ایک فقہ پر متفق نہیں ہو سکتے جن کی وجہ سے آج مسلمان کامل

انتشار کا شکار ہیں؟

ج۔ مجھے اس بات پر افسوس ہے کہ اسلام کے مختلف فرقوں میں تکثیریت کے بجائے عدم برداشت کا رویہ پروان چڑھ رہا ہے۔ لیکن جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے کہ تمام مسلمانوں کو کسی ایک فقہ پر متفق ہو جانا چاہیے تو میں کہوں گا کہ یہ نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی مطلوب۔ درحقیقت اس کا مطلب مسلمانوں کی ذہنی موت ہوگا۔ کیونکہ یہ بالکل فطری بات ہے کہ مختلف علاقوں، مختلف ادوار، مختلف مسائل اور مختلف پس منظر سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک ہی معاملے پر مختلف نتائج تک پہنچیں۔ اسلام کی یہی وسعت ہے جس نے اسے تمام زمانوں کے لیے قابل قبول اور راہنما بنایا ہے۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مختلف مکاتب فکر کے ماننے والے فروعی مسائل پر زور دینا اور اپنی تعبیر کو حرفِ آخر تسلیم کرنے پر اصرار کرنا شروع کر دیں۔ حالانکہ تمام مکاتب فکر کے ائمہ کرام نے ہمیشہ اپنی رائے ظاہر کرنے کے بعد واللہ اعلم کہا ہے یعنی اصل علم اللہ ہی کو ہے۔ انہوں نے کبھی اپنی رائے پر اصرار نہیں کیا اور واضح کیا کہ: ''میں سمجھتا ہوں کہ فلاں معاملہ یوں ہے مگر ممکن ہے میں غلط ہوں''۔ اگر اس اسپرٹ کو برقرار رکھا جائے اور اپنایا جائے تو مسائل پیدا نہ ہوں۔

س. آپ کے اسلام قبول کرنے کا بڑا محرک کیا تھا. یعنی کس چیز نے آپ کو اسلام کی طرف راغب کیا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ نے کہا ہے کہ مغرب سے اس کے مسائل کے تناظر میں، ان کے حل کے لیے براہ راست بات کرنی چاہیے. تو اسلام کیسے مغربی معاشرے میں موجود دباؤ (stress) کو کم کرنے یا ختم کرنے میں مدد دے سکتا ہے. اور ہمیں ان مسائل پر کیسے بات کرنی چاہیے؟

ج۔ آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ امریکہ میں اس وقت تقریباً ہر شخص کو زندگی میں کبھی نہ کبھی ماہر نفسیات کی خدمات حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن اگر آپ وقت اور زندگی

کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر اپنائیں، اپنے طرز زندگی میں اسلامی ترجیحات کو ملحوظ خاطر رکھیں، اگر آپ دن میں پانچ بار خدا تعالیٰ کی ہستی کی طرف رجوع کریں تو مجھے یقین ہے کہ آپ کبھی ذہنی دباؤ کا شکار نہیں ہوں گے۔ میں نے اپنے تجربے سے یہ معلوم کیا ہے کہ یہ کام کی کثرت نہیں ہے جو کسی انسان کو دباؤ کا شکار کرتی ہے بلکہ اس کی وجہ کام نہ کر سکنے کا خوف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی ادارے کے افسران عموماً دباؤ کا شکار نہیں ہوتے۔ وہ غلطیاں بھی کم کرتے ہیں اور کام بھی زیادہ کرتے ہیں۔ جو کچھ افسر کرتا ہے وہی درست ہوتا ہے اور وہی مطلوب ہوتا ہے۔ چنانچہ جب آپ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے آپ غلطی نہیں کرتے تو لازماً دباؤ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ میرا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ جو دباؤ کا شکار ہوتا ہے وہ مسلمان نہیں ہوتا، یقیناً نہیں۔ لیکن میرا عموماً رجحان یہ ہے کہ جب دنیا والے اسلامی طرزِ زندگی اپنائیں گے تو انہیں ماہرین نفسیات کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہی وہ چیز ہے جس پر خود عمل کرنے کی اور دنیا کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک آپ کے پہلے سوال کا تعلق ہے میرا نہیں خیال کہ کوئی اس قطعی محرک کی واضح نشان دہی کر سکتا ہے جو اس کے قبول اسلام کا باعث بنا۔ کیونکہ اسلام تک پہنچنے کے مختلف راستے ہیں اور ہر شخص کے لیے یہ راستہ مختلف ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کو اس بات کا بالکل صحیح اور قطعی جواب دے سکے کہ وہ اس سے کیوں پیار کرتا ہے تو میں اس فکر میں پڑ جاؤں گا کہ کیا واقعی اس کو پیار ہے بھی کہ نہیں؟ ہم یہ کیوں کہتے ہیں کہ ہم خدا کے وجود پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہم یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہم خدا کے وجود کو جانتے ہیں؟ ہم کیوں کہتے ہیں کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبر ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ کیوں نہیں کہتے کہ چونکہ ہم یہ بات جانتے ہیں اس لیے مانتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان اور اعتقاد کو عقل و خرد کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ اگر ہر چیز کو ثابت کیا جا سکتا تو ایمان کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہم کسی پروفیسر سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتے کہ جس طرح وہ سائنسی

علوم میں حتمی نتائج نکالتا ہے اسی طرح ایمان کے جوہر کو بھی ثابت کرے۔ میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں، میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے اور مجھے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔

س. آپ نے مغرب کے اندیشوں کے ضمن میں تین مسائل جمہوریت، انسانی حقوق اور حقوقِ نسواں کا بطور خاص حوالہ دیا ھے. میں خواتین کے حقوق کے بارے میں بات کرنا چاھتا ھوں. آپ نے آیت "الرجال قوامون علی النساء" کا حوالہ دیا ھے کہ مردوں کو عورتوں پر قوام بنایا گیا ھے جہاں تک میں سمجھتا ھوں اللہ نے انسان کا لفظ عورتوں اور مردوں دونوں کے لیے استعمال کیا ھے. کیونکہ "قوام" سے یہاں مراد "مقام" ھے. مسئلہ یہ ھے کہ مسلمان مرد حقیقتاً یہ مقام نہیں چاھتے اور اگر کسی کے پاس یہ مقام ھے تو اس کا مطلب ھے کہ اسے عورتوں کو تحفظ فراھم کرنا ھے. آپ نے اس آیت کا مطلب یھی لیا ھے اور شائد ھم تحریک نسواں پر زیادہ تفصیل سے بات کر سکتے ھیں. اور مغربی معاشرے میں عورتوں کی صورت حال پر بطور خاص.

ج۔ میں نے اس آیت کریمہ کے تقریباً ۲۷ مختلف انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور ترکی ترجموں کا موازنہ کیا ہے۔ اکثر نئے ترجمے "قوامون" کو مرد کی عورت پر برتری کے روایتی معنوں میں نہیں بیان کرتے بلکہ ان کے مطابق ''مرد عورتوں کا خیال رکھنے والے ہیں اور مرد عورتوں کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔ اور اگر عورتیں اس آیت کا ترجمہ کرتیں تو شائد صدیوں پہلے ہی اس کو مختلف انداز میں بیان کیا جاتا۔ بہت سی عورتوں نے مغرب میں اس لیے اسلام قبول کیا ہے کہ انہیں یقین ہے کہ آزادیٔ نسواں کے مقصد کو اسلامی طریقے سے زیادہ بہتر طور پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسلام ان کے وقار کی حفاظت کرتا ہے۔ وہ دیکھتی ہیں کہ مغرب میں عورتیں جو کچھ حاصل کرنا چاہتی ہیں عموماً انہیں اس کا متضاد حاصل ہوتا ہے۔ وہاں ابھی تک عورتوں کے درمیان مقابلہ ہائے حسن

منعقد ہوتے ہیں جو عورت کے وقار کو کم کرتے ہیں۔ عورتوں کو کسی بھی چیز کو فروخت کرنے کا آلہ بنا لیا گیا ہے اور انہیں ان میدانوں میں مردوں کا مقابلہ کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے جہاں ان کے لیے فطرتاً مردوں کا مقابلہ کرنا مشکل بلکہ بعض صورتوں میں ناممکن ہے۔ یہ خواتین ان خرابیوں کا ادراک رکھتی ہیں۔ وہ یہ چاہتی ہیں کہ انہیں ان کے پورے وقار کے ساتھ ایک شریک کار کے طور پر اور ایک انسان کے طور پر تسلیم کیا جائے اور ایسا اسلام میں ہی ممکن ہے اور یہی ان کے قبولِ اسلام کا سبب ہے۔

س۔ انٹرنیٹ کے مثبت اور منفی استعمال پر روشنی ڈالیے کہ مسلمانوں کو کس حد تک اس میدان میں کام کرنے اور انٹرنیٹ پر کیے جانے والے پروپیگنڈے اور غلط معلومات کا سدباب کرنے کی ضرورت ہے؟

ج۔ انٹرنیٹ دیگر بہت سے مشینی آلات اور ایجادات کی طرح ایک جدید آلہ ہے اس کو مثبت اور منفی دونوں طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کو اس میدان میں بہت آگے بڑھ کر اور بہت سرگرمی کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر انٹرنیٹ کے ذریعے کوئی بھی قرآن کے غلط متن اور غلط تشریحات کو پھیلا سکتا ہے سوائے اس کے کہ مسلمان خود بھی انٹرنیٹ پر موجود ہوں اور ایسی چیزوں سے آگاہ رہیں اور قرآن کے صحیح مطالب اور تشریحات کو دوسروں تک پہنچائیں۔

س۔ آپ نے کہا کہ عورتوں کو وہ حقوق دینے کے لیے جو خود اسلام انہیں دیتا ہے، تقریروں سے زیادہ عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ مسلمان عورتوں میں ان کے حقوق کا شعور پیدا کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ کیونکہ حقیقتاً عام مسلمان مرد و خواتین میں سے کوئی بھی ان کا حقیقی شعور نہیں رکھتا۔

دوسرا سوال جیسا کہ آپ نے فرمایا اور میں اس کی تحسین کرتی ہوں کہ کوئی بھی تہذیب جو خواتین کی صلاحیتوں سے فائدہ نہ اٹھا سکی وہ ناکام ہو جائے گی۔ تو آپ کے خیال میں مسلمان خواتین کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے کیا اقدامات کرنے کی ضرورت ہے؟

ج۔ تاریخ اسلام کا ایک پہلو بہت افسوس ناک ہے کہ یہ اپنے ظہور کے کچھ ہی عرصہ بعد قبل از اسلام کے کچھ منفی تصورات کی طرف لوٹ گیا، خصوصیت سے خواتین کے معاملے میں۔ آپ جانتے ہیں کہ قرآن اپنی معتبر ترین صورت میں پورے استشہاد کے ساتھ آج ہمارے درمیان موجود ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ایک خاتون [ام المومنین] ''حفصہؓ'' نے اس کی حفاظت فرمائی۔ ہمارے پاس معتبر ترین اور بہت بڑی تعداد میں احادیث حضرت عائشہؓ سے روایت شدہ ہیں۔ جنگ جمل میں انہوں نے اپنی فوج کی قیادت بھی کی۔ خواتین نے اس دور میں غزوات میں حصہ لیا، جنگوں میں شرکت کی، تیر جمع کیے اور وہ فوج کا باقاعدہ حصہ تھیں۔ پھر آپ دیکھتے ہیں کہ بہت کم عرصے بعد خواتین کے بارے میں تمام صورت حال بدل گئی۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہر مرد کی ماں ایک خاتون ہوتی ہے اور اگر خواتین تعلیم یافتہ نہیں ہوں گی تو مرد بھی تعلیم نہیں پائیں گے۔ کسی تہذیب کی ترقی کے لیے یہ ایک بڑا اہم نکتہ ہے۔ اگر خواتین اپنے حقوق سے قطعی نابلد ہوں اور ان کی برین واشنگ کر دی جائے تو کسی تبدیلی کا آنا بڑا مشکل ہے۔ میں نے ایک بار الجزائر میں حقوقِ نسواں پر لیکچر دیا اور انہیں بتایا کہ میں الجزائر کی جنگِ آزادی کے دوران الجزائر میں تھا۔ یہ جنگ آزادی کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتی تھی اگر دورانِ جنگ الجزائری خواتین کی خدمات میسر نہ ہوتیں، اور اب میں یہ دیکھتا ہوں کہ آپ مکمل پردے میں خاموش بیٹھی ہیں اور آپ نے معاشرے میں کم اہم کردار قبول کر لیا ہے۔ ایسا کیونکر ہوا؟ وہ میری گفتگو سے خوش نہ تھیں کہ ان کی برین واشنگ ہو چکی تھی۔ ۲۵ سال بعد اس معاشرے میں جسے بچانے کی جدوجہد میں وہ بھی شریک تھیں،

ان کی حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی۔

جرمنی میں ۱۰ جرمن خواتین نے جن میں سے ۵ عرب اور ۵ جرمن نژاد تھیں، قرآن پر بہت بڑا کام کیا ہے۔ انہوں نے ۱۵ سال تک مختلف تفاسیر کے ۳۰۰۰ صفحات پر کام کر کے ایک تفسیر تیار کی ہے۔ یہ ایک مثال ہے کہ خواتین کس طرح اکٹھے ہو کر کام کر سکتی ہیں اور خود اپنے حقوق کے بارے میں جان سکتی ہیں، نہ کہ وہ انتظار کریں کہ مرد آ کر انہیں ان کے حقوق کے بارے میں بتائیں۔

اسلام اور دورِ حاضر کا نظریاتی بحران:

س. مسلمان ممالک کی حکومتوں کے اسلام کے بارے میں رویے پر آپ کچھ کہیں گے؟

ج۔ حقیقت یہ ہے کہ خود مسلم دنیا کی بہت سی حکومتیں اسلام کے احیاء سے خوف زدہ ہیں۔ انہیں اسلام کے بطور طرزِ زندگی اور نظریہ حیات ترویج سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ زیادہ تر مغرب کی تقلید اور اتباع کی روش پر گامزن ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جس کے بارے میں مناسب ردِعمل سامنے آنا چاہیے۔ آپ جانتے ہیں کہ بیشتر اسلامی تحریکوں کے مراکز مسلم دنیا کے بجائے یورپ میں قائم ہیں کیونکہ دوسری صورت میں ان کے لیے زیادہ دیر زندہ رہنا مشکل تھا۔

س. ذرائع ابلاغ کی جنگ میں جسے عرف عام میں میڈیا وار کہا جاتا ہے، مسلمان کس جگہ کھڑے ہیں اور مغربی ذرائع ابلاغ کے طوفان سے اور مضر اثرات سے ہم اپنی نئی نسلوں کو کیسے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟

ج۔ یقیناً یہ سچ ہے کہ مسلمان میڈیا وار شروع ہونے سے پہلے ہی اسے ہار چکے ہیں۔ جہاں تک انٹرنیٹ کا معاملہ ہے تو یہ بھی اسی طرح ہے جس طرح ٹی وی ہے۔ یا جس طرح مسلمانوں کا عمومی

طور پر مغرب میں رہنا ہے۔ درحقیقت ہمیں تعلیم کے بارے میں اپنے پورے طرزِ عمل کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ مغرب میں مسلمانوں کا عمومی طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ معاشرے اور ذرائع ابلاغ کے برے اثرات سے اپنے بچوں کو محفوظ رکھنے کے لیے انہیں گھروں کی چار دیواری میں محدود رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس طرح اپنے بچوں کو بچایا نہیں جا سکتا۔ اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم خود اپنے بچوں کی تربیت پر زیادہ توجہ دیں۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی بھی دیکھیں، ساتھ ساتھ اس پر رواں تبصرہ کرتے جائیں۔ انہیں یہ موقع نہیں دینا چاہیے کہ وہ اکیلے خود سے ان کے اثرات قبول کریں اور ان کے مطابق اپنے تصورات تشکیل دیں۔ بلکہ ہمیں ان کے ساتھ موجود ہونا چاہیے کہ انہیں اچھی اور بری باتوں کے بارے میں ساتھ ساتھ بتاتے جائیں۔ ان میں اچھائی اور برائی، نیکی اور بدی کو سمجھنے کا شعور پیدا کریں، ورنہ دوسری صورت میں اور پرانے طریقوں سے ہم انہیں اس تباہی سے نہیں بچا سکیں گے۔

س. صدیوں کی تاریخ گواہ ہے کہ مسلم عیسائی تعلقات کے ضمن میں مسلمانوں نے عیسائیوں کی نسبت زیادہ برداشت اور افہام و تفہیم کا مظاہرہ کیا. آپ کی اس سلسلے میں کیا رائے ہے؟

ج۔ مسلمانوں اور مسیحیوں کے سپین اور یونان میں حیرت انگیز طور پر مختلف رویوں کا موازنہ کر کے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کے پاس برداشت اور مذہبی تکثیریت کی گنجائش مسیحیوں کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ اس کی وجہ مسلمانوں کی مذہبی رواداری اور مسیحیوں کی یک سنگی معاشرت ہے۔ جو لوگ مسلمانوں کا پیغام سنتے ہیں وہ مسلمان ہو جاتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں ہر سال سینکڑوں اور ہزاروں لوگ مسلمان ہو رہے ہیں۔ مجھے امریکہ میں مسلمانوں کے ایک مرکزی اجلاس میں شرکت کا موقع ملا تھا جس میں تیس ہزار کے قریب لوگوں نے شرکت کی تھی۔ ان میں زیادہ تعداد نوجوانوں کی تھی اور نوجوانوں میں بھی خواتین کی تعداد زیادہ تھی۔ درحقیقت جرمنی،

فرانس اور برطانیہ میں مردوں کی نسبت عورتوں میں اسلام قبول کرنے کا رجحان زیادہ ہے۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ ان خواتین کے خاندان میں کوئی ایک ایسا فرد بھی نہیں ہوتا جس کی ہمراہی میں وہ مکہ کا سفر (برائے حج) کر سکیں۔